وعظ

العبادة

(حقیقتِ عبادت)

عبادت کے متعلق یہ وعظ حضرت تھانویؒ نے حکیم عبدالرحمٰن کے مکان واقع ترب بازار حیدرآباد دکن میں مورخہ ۲۵/ ذی الحجہ بروز پنجشنبہ بعد ظہر کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ رجال ونساء کا مجمع ۱۰۰ کے قریب تھا۔ اسے محمد عبدالحلیم نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیّدنا ومولانا محمد عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَیْنَہُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ط ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴾(۱)

''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سو تو اُس کی عبادت کیا کر اور اُس کی عبادت پر قائم رہ۔ بھلا تو کسی کو اُس کا ہم صفت جانتا ہے؟''۔

تمہید

چونکہ وقت مختصر ہے لہٰذا مختصر مضمون اختیار کیا گیا ہے لیکن اختصار پر بھی وہ کافی وافی ہے (۲) کیونکہ وہ اصل ہے تمام ضروری مضامین کی، اور اصل اس وجہ سے ہے کہ اس کا ذہن میں راسخ (۳) کر لینا تمام عمر کی رہبری کے لئے کافی ہے۔ اور ہر چند کہ وہ مضمون تمام فروع اور جزئیات (۴) کے احاطہ کے لئے کافی نہیں،

(۱) سورہ مریم آیت: ۶۵ (۲) باوجود اختصار کے وہ کفایت کرنے والا ہے (۳) ذہن میں پختہ طور پر جمالینا (۴) تمام فروعی اور جزئی مسائل کا احاطہ نہیں کرتا۔

مگر فروع کے تجسس و تفحص اور تحقیق (۱) کے لئے کافی ہے یعنی اُس اصل کے نہ جاننے سے ہم جیسی اب غفلت کر رہے ہیں کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ ہم میں کسی چیز کی کمی ہے۔ پھر اس کوتاہی کی اصلاح اس اصل کے مستحکم کر لینے سے ہو جائے گی اور اسی سے اُس مضمون کی اہمیت بھی معلوم ہو جائیگی لہٰذا اس اختصار پر نظر نہ کی جاوے بلکہ بیداری (۲) اور توجہ کے ساتھ سننا چاہئے نیز ہمارے اندر ایک کمی تو غفلت اور جہل کی ہے اور ایک کمی یہ ہے کہ اگر علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ علم درجۂ قال (۳) ہی تک محدود رہتا ہے حال نہیں بنتا یعنی عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر کبھی اپنی کوتاہی اور غفلت کا علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ تنبہ درجۂ قال ہی تک محدود رہتا ہے۔ (۴)

معنیٔ قال و حال

کیونکہ قال سے صرف زبان ہی سے کہنا مراد نہیں تاکہ علم کے قال ہونے پر اشکال ہو بلکہ قال دونوں کو عام ہے۔ قال باللسان کو بھی اور قال بالجنان (۵) کو بھی۔ جیسے کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی بلکہ اصل تو قال بالجنان (۶) ہی ہے جیسے کلام نفسی اصل ہے اور کلام لفظی محض دلیل ہے کلام نفسی پر جیسا کہا گیا ہے ؎

ان الکلام لفی الفُؤاد وانما
جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا (۷)

(۱) مگر اس مضمون کو سنکر دیگر فرعی اور جزئی مسائل کے معلوم کرنے کا تجسس اور تحقیق و تفتیش کی اہمیت سامنے آجائیگی اور فکر پیدا ہو گی (۲) مضمون کے مختصر ہونے کا خیال نہ کیا جائے بلکہ اس کو خوب توجہ سے سنا جائے (۳) صرف زبانی گفتگو تک ہی محدود رہتا ہے (۴) یعنی صرف زبان سے اتنا کہنے ہی کو کافی سمجھتے ہیں کہ ہم سے اعمال میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے اس کو دور کرنے کی عملی کوشش نہیں ہوتی۔ (۵) زبان سے کہنے اور اعضاء وجوارح سے کہنے دونوں کو شامل ہے (۶) اصل تو جوارح اور اعضاء ہی سے کہنا ہے (۷) کلام تو اصل میں دل میں ہوتا ہے اور زبان تو اس دل کے کلام کی معبر ہوتی ہے۔

اسی قال کے لفظ کو ہم تصور کے لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب خواہ آپ تصور کہیئے یا قال بالقواد (۱) کہیئے۔ بس ہمارا علم اس درجہ سے آگے نہیں بڑھتا یعنی حال نہیں ہو جاتا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص پر قتل کا مقدمہ ہو اور اس کا علم اس کے پڑوسی کو بھی ہے مگر صاحب معاملہ اور پڑوسی کے علم میں بہت فرق ہے صاحب معاملہ کا تو وہ حال بن جاتا ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں ہر وقت اُسی کے تدبر (۲) واہتمام میں لگا رہتا ہے۔ کہیں گواہوں کی تلاش ہے کہیں پیروی کے واسطے اچھے وکیل کی جستجو اور کہیں بیان تحریری وغیرہ کی فکر اور کہیں وسائل و سفارش کی کوشش۔ غرض وہی ہر وقت اسی کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ وہ کھاتا ہے مگر اس کا کھانا نہ کھانے سے بدتر۔ وہ سوتا ہے مگر سونا جاگنے سے بدتر۔ بہرحال اپنے تمام ضروریات وحوائج (۳) بھی پورے کرتا ہے مگر دُھن اور فکر کسی اور ہی چیز کی ہے۔ اور ایک اس کا پڑوسی ہے کہ اُسے بھی اس معاملہ کی اطلاع ہے۔ پھر ایک تو وہ پڑوسی ہے جسے اس کے ساتھ عناد (۴) ہے۔ وہ تو اُلٹا خوش ہوگا اور ایک وہ پڑوسی ہے جسے اس سے ہمدردی ہے اور اُس کو علم ہے کہ ایسا سنگین مقدمہ قائم ہے اور خوف عقلی بھی ہے کہ ایسا نہ ہو۔ مقدمہ اس کے خلاف فیصل ہو۔ مگر اسے بھی وہ دُھن (۵) نہیں ہے۔ سو یہ دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت قال ہے اور دوسری حال۔ اُس صاحب معاملہ کے لئے تو یہ مقدمہ حال بن گیا (۶) اور پڑوسی کے لئے قال (۷) ہے۔

---

(۱) اب چاہے اس کو تصور کہیئے یا دل کا کلام کہہ لیجئے (۲) ہر وقت اسی کی فکر میں لگا رہتا ہے (۳) تمام ضروری کام اور حاجتیں بھی پوری کرتا ہے (۴) دشمنی ہے (۵) فکر نہیں (۶) یعنی ہر وقت اسی فکر میں ہے (۷) یعنی کبھی زبانی تذکرہ کر لیا اور بس۔

اسی طرح ہماری حالت بھی دوسرے درجہ کی حالت ہے پھر افسوس ہے کہ اپنا ہی معاملہ اور ایسی بے فکری۔ تو یہ بھی ایک فرد (۱) ہے غفلت کی کہ توجہ اُس درجہ کی نہ ہو جس درجہ کی ضرورت ہے۔

غرض جس طرح عدم العلم (۲) ایک کوتاہی ہے اسی طرح عدم الالتفات یا عدم التوجہ بھی ایک کوتاہی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر دونوں کوتاہیاں ہیں کہ یا تو علم ہی نہیں یا علم ہے تو التفات نہیں۔ اس اصل (۳) کے راسخ کرنے سے اس کا بھی تدارک ہو جائے گا۔ کیونکہ عبادت کی حقیقت علم و عمل کے جمع کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس مضمون کو بہت ہی ضروری سمجھا جاوے اور اس کے اختصار پر نظر نہ کی جاوے۔

آخر مباحث علمیہ میں بھی تو یہی بات ہے کہ مقدمات میں طول ہوتا ہے اور مقصود میں اختصار ہوتا ہے۔ اسی طرح مقاصد معاشیہ میں بھی ہے۔ چنانچہ کھانے کو لیجئے کہ اس کے مقدمات کتنے طویل ہیں۔ زمین درست کرو، ہل چلاؤ چھ مہینے تک پانی سے سینچو اور کھیت کی حفاظت کرو۔ پھر غلہ کاٹو۔ پھر اُس کا بھوسہ الگ کرو۔ پھر پیسو، پھر پکاؤ۔ تب کھاؤ۔ مقصود کتنا مختصر ہے کہ ایک منٹ میں لقمہ بنا کے کھا جاؤ اور مقدمات کس قدر طویل ہیں جس میں چھ مہینے صرف ہوتے ہیں۔

جیسے ایک پیر جی تھے۔ تین تین سیر کھا جاتے اور چلتے تھے چالیس چالیس کوس۔ دونوں کام میں کامل تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کھانا کون سا مشکل ہے، منہ میں رکھا نگل لیا، منہ میں رکھا نگل لیا، اور چلنا کیا مشکل ہے۔

(۱) یہ بھی غفلت کی ایک قسم ہے (۲) جیسے علم نہ ہونا غفلت ہے (۳) اسی طرح اصلاح کی طرف توجہ نہ ہونا بھی غفلت ہے۔

پاؤں اٹھایا آگے رکھ دیا۔ پاؤں اٹھایا آگے رکھ دیا۔

یہ کھانے کے اختصار پر یاد آ گیا۔ دیکھئے کھانے کے مقدمات تو چھ مہینے میں ختم ہوتے ہیں اور خود مقصود کتنا مختصر ہے۔

مقصود بالبیان

آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ تقریر کو اس کے طول و عرض سے مہتم بالشان (۱) سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مقصود اُس میں بھی مختصر ہی ہوتا ہے۔ بہرحال یہ مضمون بھی مختصر ہے اور اس کا مجمل عنوان ہے ''عبادت''۔ اسے بھی سن کر ایک وسوسہ ہوا ہوگا کہ ارے یہ تو وہی پرانا مضمون ہے' جسے رات دن سنتے رہتے تھے۔ یہ بھی آج کل ایک مرض ہے کہ ہر چیز میں جدّت کی تلاش ہے حتی کہ مضمون بھی نیا ہی چاہتے ہیں۔ حالانکہ مضمون کا نیا ہونا تو آفت ہے کیونکہ وہ اگر مستند الی الوحی (۲) ہوتو پرانا ہوگا۔ اور اگر نہ ہوتب نیا ہوگا' تو جو مستند الی الوحی (۳) نہیں وہ تو بدعت ہوگا اور'' کل بدعة ضلالة'' (۴) کے تحت میں داخل ہوکر گمراہی پھیلانے والا ہوگا۔ غرض جو مضمون مستند الی الوحی ہوگا' وہ تو پرانا ہی ہوگا۔ مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ مضمون بھی نیا ہی ہوگا۔ باعتبار معنوں و تدوین و تحقیق کے نہیں بلکہ نیا باعتبار عنوان و علم کے ہوگا۔ یعنی ہے تو پرانا ہی مگر سامعین کو اب معلوم ہوگا۔ اس لئے علم کے اعتبار سے نیا ہے۔

جیسے کوئی مریض جسے مختلف نسخہ جات استعمال کرنے کے بعد بھی شفا نہ ہوئی ہو کسی طبیب کے پاس جائے اور یہ درخواست کرے کہ حکیم صاحب

(۱) جتنی لمبی چوڑی تقریر ہو اس کو عظیم الشان سمجھتے ہیں (۲) اگر وہ مضمون قرآن و حدیث سے مستنبط ہوگا تو پرانا ہی ہوگا کہ ۱۴ سو سال پہلے بیان کیا گیا تھا (۳) جو وحی الٰہی سے مستنبط نہیں وہ بدعت ہوگا (۴) اور ہر بدعت گمراہی ہے کیوجہ سے نا قابل التفات ہے۔

کوئی نیا نسخہ لکھئے' ان پرانے نسخوں سے تو شفا نہیں ہوتی اور حکیم جی اُسے نیا نسخہ کہہ کر لکھ دیں۔ مگر وہ بھی پرانا ہی ہوگا کہ منقول تو قدماء (۱) ہی سے ہے۔ ہاں باعتبار حاصل ہونے کے مریض کو نیا معلوم ہوگا۔

غرض جدّت کی حیثیتیں مختلف ہیں' سو اگر اس اعتبار سے کوئی جدت کا متمنی ہو' تو بے جا نہ ہوگا۔ تو اس درجہ میں یہ مضمون بھی نیا ہے۔ ایک رسم اور ہوگئی ہے کہ اصلاح کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ نئے مضمونوں میں بھی وہ مضامین انتخاب کرتے ہیں جس میں ذرا گرمی ہو۔ حالانکہ وہ مضامین انتخاب کرنا چاہئیں جن کی ضرورت ہو۔ سو جو مضمون بیان ہوگا الحمدللہ وہ ضروری بھی ہے اور اس میں دونوں حیثیتیں بھی جمع ہوگئیں کہ حقیقت کے اعتبار سے قدیم اور عارض کے اعتبار سے جدید (۲)۔ غرض اس میں جدت کی بھی حیثیت ہے۔ اب تو جدّت پسندوں کے مذاق میں بھی توجہ کے لئے کافی ہوگا۔

اگر کوئی کہے کہ معنوں کی طرح عنوان بھی تو پرانا ہی ہے یعنی عبادت' تو جواب یہ ہے کہ عنوان گو پرانا ہے مگر جب اُس کی حقیقت ہم نہیں سمجھتے تو اس اعتبار سے وہ جدید ہی ہے۔ پھر حقیقت نہ سمجھنے کی بھی دو حالتیں ہیں: ایک نہ سمجھنا اور ایک مستحضر (۳) نہ رکھنا کہ میں نے اوپر اُس کو بھی نہ سمجھنے سے تعبیر کر دیا۔ پھر اس کے بعد جو عملی کوتاہی ہوگی وہ تیسرے درجہ میں ہوگی۔ اس لئے اس مضمون میں جو اول درجہ ہے یعنی عبادت کی حقیقت نہ سمجھنا وہ اول سمجھائی جائے گی۔ کیونکہ حقیقت ہی سے سب کو غفلت ہے۔ ضرورت تو قریب قریب سب جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت بہت مشہور ہے:

(۱) یہ نسخہ بھی پہلے حکیموں ہی سے نقل ہوکر آیا ہے البتہ مریض کو اب ملا ہے اس لئے اس کے واسطے نیا ہے
(۲) حقیقت کے اعتبار سے پرانا اور ضرورت کے اعتبار سے نیا ہے۔ (۳) ہر وقت اس کا دھیان نہ کرنا۔

﴿ وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾ (۱)

''میں نے جنّ اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں''

پیدائش کی غرض و غایت

عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلقِ جنّ و انس (۲) کی بھی ہے۔ اور یہاں جنّ کو بھی انسان کے ساتھ ذکراً شریک کیا گیا ہے۔ اور دوسرے اکثر مقامات میں باوجود یکہ جنّ بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلّف (۳) ہیں مگر پھر بھی تعبیر میں جو جنّ کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء (۴) ہے۔ لہذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے۔ ورنہ احکامِ شرعیہ دونوں ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز (۵) اس کے اور کوئی مقصود ہی نہیں۔ تمام مقاصد کا انحصار کر کے فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں۔ اور اُس حصر (۶) سے باوجود یکہ سب غایات کی نفی ہوگئی مگر پھر بھی جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ ہوسکتا تھا' اس مقام پر ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔ کلامِ الٰہی میں ہمارے عادات ومحاورات کی بے حد رعایت کی گئی ہے۔ بعض غایات کو تو انسان بھی غایت نہیں سمجھتا۔ اس کی نفی کی ضرورت نہ تھی جن کو مقصود سمجھنے کا احتمال تھا۔ صرف انہیں کی نفی کی گئی چنانچہ آگے ارشاد ہے:

﴿مَـااُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ط اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ

---

(۱) سورۃ الذاریات آیت: ۵۶ (۲) انسان اور جنات کی پیدائش کا مقصد ہی عبادت کرنا ہے (۳) تمام شرعی احکام کے پابند ہیں (۴) کہ صرف انسان کے ذکر پر کفایت کرلی ورنہ احکام کے پابند جنّ بھی ہیں (۵) سوائے اس کے (۶) اس تخصیص اگرچہ باقی سب غرضوں کی نفی ہوگئی۔

ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾(۱)

''میں اُن سے (دوسری مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں۔ اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے۔ قوت والا' نہایت قوت والا ہے''

سبحان اللہ کیسی بلاغت ہے کہ ع

بریں طرز گر جاں فشانم رواست (۲)

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اس حصر اور اس وعدہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی فی الدنیا(۳) اکثروں کا مذہب ہوگیا ہے۔ کفار و ملاحدہ تو دنیا پرست(۴) ہیں ہی ان سے دنیا طلبی کچھ بھی بعید نہیں۔ تعجب تو مسلمان پر ہے کہ باوجود اسلام کے پھر طالب دنیا کیوں ہے؟

کسبِ دنیا اور طلبِ دنیا کا فرق

میرا کاسبِ دنیا(۵) پر اعتراض نہیں ہے۔ اس کے لئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں: (کسب الحلال فریضة بعد الفریضة)(۶)۔ دیکھئے کسب حلال کو فرض تک فرمایا لیکن طلب کے درجہ کی کس قدر صریح عنوان سے مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: (حُبّ الدنیا رأس کل خطیئة)(۷)۔ اب اس میں یہ غلطی ہوجاتی ہے کہ غیر محقق علماء تو

---

(۱) سورۃ الذاریات آیت ۵۷، ۵۸ (۲) اس انداز بیان پر اگر جان بھی قربان کردی جائے تو درست ہے (۳) دنیا میں ترقی کا حصول (۴) کفار اور ملحدین تو دنیا کے پجاری ہیں ہی (۵) دنیا کمانے والے پر (۶) حلال روزی کمانا نماز روزہ فرائض کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے (۷) دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔

مطلقاً دنیا چھوڑاتے ہیں کہ دنیا کی ثروت (۱) اصلا نہ حاصل کرو بلکہ ذلیل بن کے رہو استغفراللہ! یہ ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود نہیں۔ ہاں آپ کا مقصود یہ ضرور ہے کہ فرعون بن کے نہ رہو۔ اس لئے یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اس قدر ترقیٔ دنیا کے درپے نہ ہو کہ اُسی کو مقصود بالذات قرار دے لو۔ یہ درجہ حُبِّ دنیا ہے خواہ جاہ کی (۲) طلب ہو یا مال کی۔ اس درجہ میں اس کی تحصیل وطلب ہی حُبِّ دنیا ہے اور اس کے یہ دونوں شعبے دین کو خراب کرنے والے ہیں۔ غرض حُبُّ الدنیا کو منع کیا گیا ہے نہ کہ کسبُ الدنیا (۳) کو بلکہ اُس کو تو فرض قرار دیا گیا اور اب تو کھلم کھلا حُبُّ الدنیا کی ترغیب وتعلیم دی جارہی ہے۔

حُبِّ دنیا اور کسبِ دنیا کی پرکھ کا طریقہ

اگر کوئی اس پر بھی کہے کہ ہم تو حب الدنیا کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ کسب الدنیا کی ترغیب دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس کا ایک معیار ہے وہ یہ کہ یہ دیکھ لیا جاوے کہ جب دین اور دنیا میں تزاحم (۴) ہوتا ہے تو کس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ دنیا مقصود بالذات ہے۔ اس پر حُب دین کا دعویٰ! سو اس کی بالکل وہی حالت ہے کہ گھر بار تمہارا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا۔ جو وقت دنیا کے کاموں سے بچ گیا' آؤ بھئی نماز بھی پڑھ لو' خواہ وقت تنگ ہی ہوگیا ہو بلکہ نکل ہی گیا ہو اور جماعت کا فوت ہونا تو کوئی بات ہی نہیں۔ تو یہ تحصیلِ دنیا (۵) ہی حُبِّ دنیا ہے۔

---

(۱) دنیا کی دولت (۲) اقتدار کی طلب ہو یا مال کی (۳) دنیا سے محبت رکھنا منع ہے دنیا کمانا تو فرض ہے (۴) ٹکراؤ (۵) اس انداز سے دنیا کمانا ہی حب دنیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر تزاحم کے وقت کسی نے دین کو ترجیح دی اور دنیا کی اس کے مقابلے میں پرواہ نہیں کی تو اس کی یہ تحصیلِ دنیا بھی کسبُ الدنیا ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دی اور دین کی مؤخر رکھا تو یہ حُبِّ دنیا ہے۔ بہرحال یہ اجمالی تقریر بھی حُبُّ الدنیا اور کسب دنیا کے فرق کے لئے کافی ہے۔ چونکہ ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اس طرح دنیا کو مقصود بنائے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کا تدارک (۱) فرماتے ہیں۔

﴿مَاأُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ﴾ ای لأ نفسهم ولا لعيالهم۔
﴿وَمَا أُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾ ای وما اردت بخلقهم ان يطعمونی (۲)

''یعنی میں نے اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے لئے رزق ڈھونڈیں نہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلاویں''

یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہئے کہ اطعامِ حق (۳) کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا' پھر اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ سونکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین (۴) فرمایا۔ اُن میں ایک ایسا امر ہے کہ اس کے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اس کا احتمال تھا۔ سو دونوں کو قرین فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے۔ چنانچہ اس علت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَالرَّزَّاقُ﴾ یعنی وہ تو خود بڑے رزاق ہیں کہ تم کو اور تمہارے عیال کو سب کو رزق دیتے ہیں۔

(۱) اس کی روک تھام فرماتے ہیں (۲) سورۃ الذاریات آیت ۵۷' ۵۸ (۳) اللہ پاک کو کھلانے کا مقصود ہونے کا تو احتمال ہی نہیں تھا (۴) دو ایسی باتوں کی نفی کو ملا کر بیان فرمایا جس میں ایک کی نفی کا احتمال ہی نہیں تو دوسری کو بھی ایسے ہی سمجھو کیونکہ دونوں کی وجہ مشترک ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ﴾ (۱) یہ آیت بھی اُس کے قریب قریب ہے خلاصہ یہ کہ نہایت تاکید واہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرمادیا کہ انسان کو حق جلّ وعلی شانہٗ نے صرف عبادت کے واسطے پیدا کیا ہے۔ تو عبادت اتنا بڑا امرِ اہم (۲) ہے۔

عبادت کے معنی وحقیقت

اب صرف یہ سمجھنا باقی رہا کہ عبادت ہے کیا چیز؟ سو اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ سو جو عربی جاننے والے ہیں ان کو تو اس کی حقیقت سمجھنا آسان ہے۔ مگر حق تعالیٰ کی تعظیم ایسی سہل ہے کہ اس کا فیض سب کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ لفظ عبادت ہی کو محاورات میں ایسا جاری کردیا گیا کہ اب کوئی بھی اُس سے ناواقف نہیں ہے۔ مگر غایتِ ظہور کی وجہ سے اس کی حقیقت سمجھنے میں خِفا ہوگیا (۳)۔ چنانچہ اس کا مفہوم سب کے لئے بہت ہی آسان ہے۔ جو لوگ عربی دان ہیں وہ تو لغت میں دیکھ لیں گے کہ اس کے معنی ہیں غایة التذلیل (۴) مگر عوام جو لغت نہیں جانتے اگر اُن کے سامنے صرف اسی کو پیش کیا جائے تو اُن کو یہ شبہ ہوگا کہ یہ ابھی تراشا (۵) گیا ہے۔ اس لئے میں اُن کے مستعمل محاورہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ''عبد'' کے معنی سب کو معلوم ہے کہ غلام ہیں۔ چنانچہ عوام میں بھی عبداللہ، عبدالرحمٰن نام

---

(۱) اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس پر جم جاؤ ہم تم سے رزق کا سوال نہیں کرتے ہم تم کو رزق دیتے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ آیت: ۱۳۲ (۲) اسقدر اہم کام ہے (۳) بہت زیادہ ظاہر ہونے کی وجہ سے اس کی حقیقت کو پہچاننا مشکل ہوگیا (۴) انتہائی پستی اختیار کرنا (۵) یہ مطلب ابھی گھڑا ہے۔

اسی واسطے رکھے جاتے ہیں اور عبادت اسی عبد کا مصدر ہے اور عبد اسی مصدر سے مشتق ایک صفت ہے۔ جب عبد کے معنی غلام ہیں تو عبادت کے معنی عبد شدن یعنی غلام ہوجانا یا بندہ ہوجانا ہوئے۔ بندہ فارسی ہے اور عبد اور غلام عربی ہے۔ مگر غلام کو اردو میں کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو میں سب زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں اور غلام کا لفظ بہ نسبت عبد(۱) بلکہ بہ نسبت بندہ کے بھی بوجہ کثرت استعمال کے زیادہ اقرب إلی الفہم (۲) ہے۔ بہرحال ان تینوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس سے عبادت کی حقیقتِ مجملہ (۳) تو سمجھ میں آ گئی کہ غلام ہونا ہے۔

اب تفصیل سمجھ لی جاوے۔ اور اس کے لئے مقدمات علمیہ کی حاجت نہیں بلکہ میں روز مرہ کے معاملات سے واضح کردوں گا۔ وہ یہ کہ جب غلام کی حقیقت واضح ہوگئی' تو جو لوازم ہیں غلام کے انہیں بھی اپنے اوپر لازم سمجھنا چاہئے' یہاں تک تو ان کی تعیین ہوگئی کہ وہ عبادت ہے جس پر میں بحث کروں گا۔

اگرچہ اس مبحث کے لئے آیت ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ ۔۔۔﴾ زیادہ مناسب تھی کیونکہ مشہور بھی ہے اور عموم میں صریح بھی ہے مگر صرف جدت کے خیال سے میں نے دوسری آیت پڑھی۔ کیونکہ جدّت پسندی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کثیر التلاوت نصوص (۴) سے بھی لوگوں کو وحشت ہونے لگی ہے۔ اس لئے آیتیں بھی نئی نئی تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ چنانچہ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے یہ سورۂ مریم کی ہے۔ اور سورۂ مریم کون پڑھتا ہے۔ حافظ بھی تو رمضان ہی میں مشق کرتے ہیں۔ روز مرہ کون قرآن پڑھتا ہے۔

---

(۱) غلام کا لفظ عبد کے لفظ کے مقابلے میں (۲) سمجھنے کے زیادہ قریب ہے (۳) عبادت کی حقیقت اجمالاً سمجھ میں آ گئی (۴) وہ آیات جن کی بکثرت تلاوت کی جاتی ہے۔

چنانچہ ایک حافظ فخراً کہتے تھے کہ میں صرف رمضان ہی میں پڑھتا ہوں۔ مگر یہ کہنا ایسا ہی ہوا جیسے کوئی کہے کہ فلاں میرا محبوب ہے مگر میں اُسے سال بھر کے بعد دیکھتا ہوں اور پہچان لیتا ہوں۔ اب تو اس پر فخر کرتے ہیں کہ سال بھر قرآن نہیں پڑھتے اور رمضان میں تراویح میں سنا دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر محض حافظ ہو جانا کمال ہے تو بہت سے بھوت بھی حافظ ہوتے ہیں چنانچہ بہت سے واقعات سنے ہوں گے کہ فلاں عورت پر جنّ آتا ہے اور وہ قرآن پڑھتا ہے۔ تو اصل کمال حافظ ہونا نہیں ہے بلکہ تعلق مع اللہ اور تعلق مع القرآن ہے۔ اسی کی تکمیل و تسہیل کے لئے حافظ بنائے جاتے ہیں۔ سو اگر ایسا تعلق ناظرہ خواں رکھے وہ ہزار درجہ افضل ہے ایسے حافظ سے۔

تفسیرِ آیت

بہرحال یہ آیت حافظ صاحب کے اعتبار سے بھی نئی ہے کیونکہ وہ اول تو سال بھر تک پڑھتے ہی کہاں ہیں، اور جب پڑھتے بھی ہیں تو اس پر التفات کب ہوتا ہے۔ اور اگر التفات بھی ہو تو ترجمہ کے اعتبار سے تو ضرور ہی نئی ہے بہرحال حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾

اصل لفظ فائدہ اور ماسیق لہ الکلام (۱) اس آیت میں ''فاعبدہ'' ہے اور اس کا سباق (۲) تمہید کے لئے ہے اور سیاق (۳) یعنی ''واصطبر لعبادتہ'' اس

(۱) جس بات کو بیان کرنے کے لئے یہ جملہ اور کلام کیا گیا ہے وہ اس آیت میں ''فاعبدہ'' ہے (۲) اور اس سے پہلے کا کلام یعنی ''رب السمٰوات والارض وما بینہما'' بطور تمہید ہے (۳) اور اس کے بعد کا کلام یعنی ''واصطبر لعبادتہ'' بطور تکمیل ہے۔

کا متمم ہے اور ﴿ھل تعلم له سمیا﴾ اس کی تائید(۱) ہے۔ بہرحال سباق و سیاق تمہید و تائید کے لئے ہے اور اصل مقصود ''فاعبدہ'' ہے اور ابتداء اس کی جو ''رب السمٰوات .....'' سے کی گئی ہے، تو وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی عادت ہے کہ جب کوئی مشکل کام بتاتے ہیں تو اس کے آسان کرنے کا بھی اس جگہ اہتمام فرماتے ہیں اور ''اہتمام''(۲) میں نے مجازاً کہہ دیا ورنہ ''اہتمام'' مشتق ہے ''ھَمٌّ'' بمعنی فکر سے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کلام الٰہی میں یہ بھی التزام ہے کہ سہولت کی بھی رعایت کی جاتی ہے۔

شفقتِ ربّانی

اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص تو اسکول کا ماسٹر ہے گو بچوں کو وہ تعلیم دیتا ہے مگر چونکہ پبلک کا نوکر ہے اس لئے اُسے کوئی خاص اُنس و شفقت نہیں بلکہ محض ضابطہ اور وقت کا پابند ہے۔ اُسے اس سے بھی بحث نہیں کہ میں نے جو کچھ پڑھایا وہ بچوں کی سمجھ میں بھی آیا یا نہیں کیونکہ تنخواہ دار استاد کو بچوں سے بالکل اجنبیت ہوتی ہے۔ محض اپنی تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے۔ اور ایک تعلیم ہے باپ کی کہ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا سمجھ ہی جائے۔ ان دونوں کی تعظیم میں بڑا فرق ہے ماسٹر تو اپنے گھنٹہ میں آئے اور لڑکوں کو تقریر سنا کر چل دیے اور باپ کی تعلیم یہ نہیں کہ الفاظ ادا کر دیے اور چل دیے بلکہ وہ سوچتا ہے کہ کون سے عنوان سے سمجھانا زیادہ مؤثر ہوگا۔ وہ یہی سوچے گا کہ آخر اتنے دن پڑھتے ہوئے ہوگئے نفع کیوں نہیں ہوتا؟ میں کون سی تدبیر اختیار کروں جو نفع ہو۔ کبھی ترغیب دیتا ہے، کبھی ترہیب (۳) کرتا

(۱) اور ''ھل تعلم له سمیا'' سے اس کی تائید مقصود ہے (۲) اہتمام بمعنی التزام ہے (۳) کبھی شوق دلاتا ہے کبھی ڈراتا ہے۔

ہے۔ کبھی یہ سوچتا ہے کہ میرے کہنے کا اثر نہیں ہوتا تو لاؤ اس کے کسی دوست سے کہلواؤں۔

حق تعالیٰ کی تعظیم اسی رنگ کی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے غنا(۱) کو اگر دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ان کو کیا ضرورت ہے اس قدر اہتمام کی۔ مگر کیا ٹھکانہ ہے اُن کی شفقت کا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی بندہ ہم سے جدا رہے۔ اور کیوں نہ ہو انہوں ہی نے تو ان تمام شفقتوں کو پیدا کیا۔ بس جس نے باپ کے دل میں اتنی شفقت پیدا کردی، وہ خود کیسا شفیق ہوگا۔ ع

چہ باشد آں نگارِ خود کہ بندد ایں نگار ہا (۲)

سبحان اللہ! مشکل سے مشکل تعلیم کو کیسا سہل کردیا ہے۔ مقصود تو یہ تھا کہ عبادت کیا کرو یعنی غلام بنو۔

حقیقتِ استخارہ

اس غلام بننے پر ایک حکایت یاد آئی، کانپور میں ایک بزرگ نقشبندی تھے۔ اُن سے ایک طالب علم نے بیعت کی درخواست کی۔ ان بزرگ نے اُن سے کہا استخارہ کرلو اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ استخارہ میں یہ ضرورت نہیں کہ دُعا پڑھ کر سو بھی رہے۔ حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس رواج کی اصل یہ ہے کہ سونے میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہی معمول ہوگیا ہے ورنہ سونا لازم نہیں۔ حدیث میں صرف اتنا ہے کہ دو رکعت نماز پڑھ کے دعا پڑھے اور یکسوئی کا منتظر رہے۔ بس جو جانب قلب میں راجح ہو جاوے اُس پر عمل کرے۔

(۱) بے نیازی (۲) اس کی اپنی زیب و زینت کا کیا حال ہوگا جس نے اتنی زینتیں پیدا فرمائیں۔

حقیقتِ بیعت

چنانچہ انہوں نے وہاں سے ذرا ہٹ' پھر واپس آ کر عرض کیا کہ میں نے استخارہ کرلیا۔ ان بزرگ نے کہا' ایسا مختصر استخارہ کیسے کرلیا۔ وہ کہنے لگا کہ اس استخارہ کو سمجھ لیجئے۔ میں نے الگ بیٹھ کر نفس سے پوچھا کہ بیعت کے معنی ''فروخت شدن'' (بکنا) کے ہیں اور بکنے سے تو غلام ہوجاوے گا۔ پھر غلام ہو جانے کے بعد اگر پیر بتاوے گا کہ جاگو جاگنا پڑے گا۔ اگر کہے گا کہ بھوکے رہو تو بھوکا مرنا ہوگا۔ اگر ٹھنڈا پانی پینے کو منع کرے گا' پیاسا رہنا ہوگا' مثلاً تو کیوں بیوقوف ہوا ہے کہ اچھی خاصی آزادی کو چھوڑ کر دوسرے کے قبضے میں اپنے کو دیئے دیتا ہے۔ نفس نے یہ جواب دیا کہ یہ سب کچھ سچ ہے مگر خدا تو ملے گا۔ میں نے کہا' اگر خدا بھی نہ ملے تو۔ کیونکہ وہ تیرا قرضدار تو نہیں۔ تو اُس نے جواب دیا ؎

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

وہ نہ ملیں اُن کو اختیار ہے مگر اُن کو یہ تو خبر ہوجاوے گی کہ یہ کم بخت بھی ہمارا طالب ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے ؎

ہمینم بس کہ داند ماہرویم کہ من نیز از خریدارانِ اویم
ہمینم بس اگر کاسد تماشم کہ من نیز از خریدارانش باشم (۱)

(۱) میرے لئے یہی کافی کہ میرے محبوب کو معلوم ہوجائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں شامل ہوں میں اس تماشہ میں صرف اس لئے آ کر شریک ہوگیا ہوں کہ میں بھی اس کے خریداروں میں شمار ہوجاؤں۔

اُن بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تیرا استخارہ عجیب ہے اور بیعت کرلیا اور غلامی کی حقیقت تو بیعت سے بھی دشوار ہے۔ مگر حق تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ اگر ہم ابتدا ہی سے یہ کہہ دیں گے کہ ''اعبــــده'' (اس کی عبادت کر) تو نفس آمادہ نہ ہوگا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی تمہید میں اپنی عظیم الشان صفت ارشاد فرمائی۔ یعنی ''رب السمٰــوات ....'' یہاں پر ''ھُــوَ'' مبتدا مقدر ہے اور ''رب السمٰـــوات'' اس کی خبر ہے اور اُس نے جس صفت کی خبر دی ہے وہ صفت ''اعبده'' کو مقتضی ہے اور وہ صفت ہے مسلّم (۱) تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ اب نفس کو امتثالِ امر میں خلجان (۲) نہ رہے گا۔ کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے صفات و کمالات بھی معلوم ہوگئے اور اُس کا امر (۳) بھی معلوم ہوگیا۔

احسانِ ربّانی

اور یہ طبعی امر ہے کہ صاحبِ عظمت و کمال کی اطاعت طبعاً سہل (۴) ہوتی ہے اور یوں تو حق تعالیٰ کے صفاتِ کمال بیشمار ہیں مگر ان کو ''فاعبده'' کی تسہیل میں اتنا بیّن (۵) دخل نہیں جتنا صفتِ ربوبیت (۶) ہے کیونکہ محسن کی اطاعت کی طرف آدمی زیادہ دوڑتا ہے۔ چنانچہ حکماء کی بھی اس پر نظر گئی ہے اور اس لئے ان کا قول ہے: ''الانسان عبدالاحسان'' (انسان احسان کا بندہ ہے) اور یہ اقتضاء صرف قولی ہی نہیں بلکہ عملی ہے کہ محسن کی تعظیم و تکریم صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً بھی کی جاتی ہے کیونکہ احسان میں یہ اثر ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے

(۱) تسلیم شدہ ہے (۲) اب نفس کو اس حکم کی بجا آوری میں پریشانی نہیں ہوگی (۳) حکم (۴) آسان (۵) واضح (۶) جتنا اس کی صفت رب ہونے کو دخل ہے۔

اور ربوبیت سماء وارض(۱) سے بڑھ کر کیا احسان ہوگا۔اور اسی لئے ''ربکم'' یا ''ربك'' نہیں فرمایا بلکہ ''رب السمٰوات والارض'' فرمایا۔اس واسطے کہ ''ربکم'' فرمانے سے یہ ہوتا کہ بعض صورتوں کو تو حق تعالیٰ کا احسان سمجھتے اور بعض کو نہ سمجھتے۔

مثلاً اس کو تو احسان سمجھتے کہ جنگل میں بھوکے بیٹھے تھے کہ ایک خوان کھانے کا نازل ہوگیا۔مگر اس کو نہ سمجھتے کہ مثلاً پانچ سو روپیہ کی تنخواہ ہے اور اس سے اجناس خریدے گئے اور طرح طرح کے اسباب معیشت مہیا کئے گئے۔اور کھاپی رہے ہیں۔تو یہ ان وسائط کی تربیت پر نظر کرکے یہ سمجھتا کہ میں نے بی اے (B,A) پاس کیا تھا۔اُس سے پانچ سو کی نوکری ملی اور اس سے کھاپی رہے ہیں اس میں کسی کا کیا دخل اور کیا احسان؟

قارون کی سوچ

اور یہ مذہب مسلمان کا تو ہے نہیں۔قارون کا مذہب ہے کیونکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

﴿ اَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ﴾(۲)

''تو بھی (خلق کے ساتھ) احسان کر جیسا خدا نے تجھ پر احسان کیا''۔

تو اُس نے جواب دیا:

﴿ اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ ﴾(۳)

''کہ اور کچھ نہیں صرف یہی بات ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم کی بدولت ملا ہے''

(۱) آسمان وزمین کی تربیت سے زیادہ کیا احسان ہوگا اس لئے کہ رب وہ کہلاتا ہے جو عدم سے وجود اور وجود سے درجہ کمال تک پہنچائے (۲) سورۃ القصص:۷۷(۳) سورۃ القصص:۷۸۔

اس میں خدا کے احسان کو کیا دخل؟ (نعوذ باللہ) اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ علم کیا تھا؟ ایک قول یہ ہے کہ کیمیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فن تجارت ہے غرض مختلف اقوال ہیں مگر چونکہ کسی کی تعیین دلیلِ صحیح سے نہیں اس لئے علم کو عام ہی رکھا جائے تو مناسب ہوگا۔ خواہ وہ علم کیمیا ہو' خواہ علم زراعت ہو' خواہ فن تجارت ہو' خواہ سود لینا دینا ہو۔ بہرحال کوئی تدبیر تھی مال کی جس کو اُس نے کہا ''علی علم عندی''۔

خیر وہ تو کافر تھا افسوس تو مسلمان پر ہے۔ ایک مسلمان صاحب جواب انتقال کر گئے ہیں وہ ہندوستانی ہو کر اردو غلط بولنا فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج کل یہ بھی ایک فیشن ہے کہ کوشش کر کے فخریہ اردو غلط بولتے ہیں تاکہ صاحبان بہادر سے تشبہ ہو۔ چنانچہ میں نے ایک زباندان ہندوستانی کو بولتے سنا۔ کہتا تھا کہ ہم سننا نہیں مانگتا۔ غرض وہ صاحب تھے مسلمان۔ اُن کے سامنے کسی نے کہا: انشاء اللہ ایسا ہوگا۔ کہنے لگا: کم بخت اس میں انشاء اللہ کا کیا بات ہے' یہ تو تدبیر کا بات ہے مگر انجام اُس شخص کا ایسا ہوا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو پھر کوئی بات بھی انشاء اللہ سے خالی نہ چھوڑتا۔

انشاء اللہ نہ کہنے پر گرفت

جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ نخاس(۱) کی طرف جارہے تھے کسی نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ کہا: گھوڑا خریدنے۔ کہا: انشاء اللہ کہہ لو۔ تو آپ کہتے ہیں: اس میں انشاء اللہ کی کیا بات ہے؟ روپے میری جیب میں اور گھوڑا نخاس میں۔ اتفاق سے راستہ میں کسی گرہ کٹ(۲) نے جیب کتر(۳) کے روپے کی تھیلی غائب کردی

(۱) منڈی (۲) جیب کترے نے (۳) جیب کاٹ کر۔

اب یہ ناکام واپس آرہا تھا کہ راستہ میں اتفاق سے پھر وہی شخص مل گیا' اس نے پوچھا کہ کہو بھئی گھوڑا لائے؟ کہنے لگا: میں بازار جارہا تھا انشاء اللہ۔ کسی نے روپے کی تھیلی چرالی انشاء اللہ۔ میں ناکام واپس آرہا ہوں انشاء اللہ۔ یا تو مستقبل پر بھی انشاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے یا اب ماضی پر بھی انشاء اللہ کہنے لگے۔ خدا تعالیٰ کبھی ان مغروروں کو ایسی زک پہنچاتے ہیں کہ دماغ سیدھا ہوجاتا ہے۔

سو آج کل بعض تو ربوبیت کے معتقد ہی نہیں۔ بعض کو اگر ربوبیت کا اعتقاد بھی ہے تو حال نہیں ہے۔ حال کی حقیقت ایک مثال سے سمجھئے کہ مثلاً سرکار عالی کسی کو ایک خوان بھیج دیں کہ اُسے دو تین وقت کھاوے تو بتایئے اس وقت دل میں سرکار عالی کی ایک خاص طور کی یاد ہوگی یا نہیں اور خاص درجہ کی ممنونیت کا اثر ہوگا کہ نہیں؟ اس کیفیت کو حال کہتے ہیں۔

واسطوں کی اقسام وحقیقت

اب میں پوچھتا ہوں کہ رات دن خدا کے بھیجے ہوئے خوان استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ تو کیا خدا کے ساتھ بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ نہیں' جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے خوان میں وسائط (۱) ایسے ہوگئے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ تک نظر نہیں پہنچتی۔ حالانکہ مثال مذکور میں بھی وسائط ہیں کہ سرکار عالی نے وزیر کو حکم دیا۔ وزیر نے امیر کو' امیر نے مشیر کو' مشیر نے دبیر کو اور دبیر نے لاکر بشیر کو دیے دیا۔ تو وسائط یہاں بھی ہیں مگر پھر بھی ذی واسطہ (۲) پر فوراً نظر پہنچ جاتی ہے۔

(۱) درمیان میں واسطے اتنے ہوگئے (۲) ان واسطوں پر نظر نہیں ہوتی بلکہ جس نے ان واسطوں کے ذریعے دیا ہے اس پر نظر ہوتی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ وسائط دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ سے تملیکاً وزیر کو دیا اور وزیر سے آخر تک سب نے دوسروں کو اسی طرح تملیکاً (۱) دیا۔ پھر بشیر تک پہنچ گیا۔ اور ایک یہ کہ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ یہ چیز فلاں فلاں وسائط (۲) سے فلاں کو پہنچادو۔ تو پہلی صورت میں تو یہ وسائط فی العطاء ہیں یعنی ہر ایک نے دوسرے کو عطا کیا اور دوسری صورت میں یہ وسائط فی الحکم ہیں۔ تو اول قسم میں معطی (۳) اصلی تک نظر نہیں جاتی اور دوسری قسم میں جاتی ہے تو لوگ وسائطِ عطاءِ نعمتِ حق کو قسمِ اول (۴) سمجھ رہے ہیں حالانکہ بعد غور قسم ثانی کے وسائط ہیں اب تو یہ شبہ رفع ہوگیا ہوگا کہ صاحب واسطوں کی وجہ سے حق تعالیٰ کا استحضار نہیں ہوتا۔ وجہ رفع یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا وہ آپ ہی کے لئے دیا اور جس شخص کے ذریعہ سے آپ کو ملا وہ حقیقۃً مالک نہیں محض واسطہ فی الحکم ہے پھر بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں جہاں واسطہ قسم اول کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً بارش، سورج، چاند، ستارے یہ سب یقیناً آپ ہی کے نفع کے لئے ہیں اور ان میں کسی کا واسطہ نہیں ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری (۵)

---

(۱) مالک بنا کر دیا (۲) فلاں فلاں کے ذریعہ سے اس کو پہنچادو (۳) پہلی قسم میں اصل دینے والے پر نظر نہیں جاتی دوسری میں جاتی ہے (۴) لوگ اللہ تعالیٰ کی عطاء کو پہلی قسم شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ دوسری قسم میں سے ہے (۵) بادل، ہوا، چاند، سورج، آسمان سب اس کام پر مامور ہیں کہ تجھے ایک روٹی میسر آجائے پس اس کو غفلت سے نہ کھا۔ جس کے حکم سے یہ سب تیری فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ تو اس کی فرمانبرداری نہ کرے۔

مسئلہ جبر وقدر

جب یہ حقیقت ہے تو اب کیا وجہ ہے منعمِ اصل (۱) سے غافل ہونے کی۔ صرف وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بعض عطاؤں کا ظہور آپ کے ہاتھ سے ہوا ہے؟ مگر یہ نہ دیکھا کہ آسمان وزمین جس طرح خدا کے مسخر ہیں، اسی طرح آپ بھی خدا کے مسخر ہیں۔ تو آپ کا ہاتھ بھی محض مسخرِ قدرت ہی ہوا۔ پھر اس پر نظر پڑنا سبب غفلت کا کیوں ہوجاتا ہے؟

دیکھئے میرا ہی ہاتھ ہے کہ آج کل اس میں ایسا درد ہے کہ میں اپنی پیٹھ تک نہیں کھجلا سکتا۔ اگر یہ پورے طور سے میرا ہوتا تو میرے تابع ہوتا۔ اگر انسان ذرا بھی سوچے سمجھے تو واقعات خود رہبری کرتے ہیں کہ گو ہمارے افعال اختیار یہ ہیں مگر خود اختیار ہی غیر اختیاری ہے۔ پھر اس کو حجاب سمجھنا چہ معنی (۲)۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بُرے افعال پر سزا جائز نہ ہو۔ کیونکہ اس کا بے غبار جواب ہمارے پاس یہ کافی ہے کہ وہ مالک ہیں۔ انہیں اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار ہے مگر ساتھ ہی یہ سمجھنا بھی فرض ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں اسی میں مصلحت ہوتی ہے۔ باقی اس کے آگے ذات وصفات کی بحث چھڑ جاتی ہے، جہاں کسی کی رسائی نہیں۔ بقول حافظؒ ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
کاینجا ہمیشہ باد بدست ست دام را (۳)

---

(۱) اصل انعام کنندہ یعنی اللہ سے غفلت کی اب کوئی وجہ نہیں (۲) کیا مطلب (۳) عنقا کسی کے شکار میں نہیں آتا اس لئے اپنا جال اٹھالے کیونکہ یہاں ہر شخص کا جال خالی گیا صرف ہوا ہاتھ آئی۔

اور اُن ہی کا قول ہے ؎

بحریست بحرِ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست (۱)

غرض اُس میں کسی کی عقل کو رسائی نہیں ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر و قدر کے مسئلہ میں خوض و بحث سے روک دیا ہے۔ کسی ایسے ہی مسئلہ کے متعلق ایک بزرگ سے پوچھا گیا۔ فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد (۲)

جب گل و بلبل کے رموز ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں تو اسرار الٰہیہ کون سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے ؎

حدیث مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جُو
کہ کس نکشود و نکشاد بحکمت ایں معمّہ را (۳)

بہر حال مقصود یہ تھا کہ سب چیز حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے حتی کہ حرکت و سکون بھی کہ جب تک ان کی اجازت تھی ہاتھ ہلتا تھا اور اب اجازت نہیں ہے تو وہ پیٹھ تک نہیں کھجلا سکتا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست (۴)

مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

ماہمہ شیراں ولے شیر علم حملہ شاں از باد باشد دمبدم (۵)

(۱) سمندر تو اصل میں عشق کا سمندر ہے کہ جس کا کنارہ ہی نہیں ہے اس میدان میں جان سپرداری کے سوا چارہ نہیں ہے (۲) کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا (۳) گانے والے اور شراب کی باتیں کرو زمانے کے راز مت ڈھونڈو حکمت سے اس معمے کو کوئی حل نہیں کرسکا (۴) میری گردن میں دوست نے لگام ڈالدی وہ مجھے لئے پھرتا جہاں وہ چاہتا ہے (۵) ہم تو وہ شیر ہیں جو جھنڈوں پر بنایا جاتا ہے جو ہوا پر ہی ہر دم حملہ کرتے رہتے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ پرچم میں اکثر شیر کی تصویر بنادیتے ہیں کہ وہ جب ہوا سے ہلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کررہا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ شاں پیدا و ناپید است باد آنکہ ناپیداست ہرگز کم مباد (۱)

دوسرے مصرعہ کی تفسیر حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے فرمائی ہے ''اے از دلِ ما''، یعنی جو ذات ظاہر نہیں ہے ہمارے دل سے اُس کا تصور ہرگز کم نہ ہو ورنہ اس کی ذات کے کم نہ ہونے کی دُعا کے کوئی معنی نہیں ؎

انت کالریح و نحن کالغبار

یختفی الریح وغباره جهار (۲)

بس یہی حالت ہماری ہے۔ ہم کیا اور ہمارا کمال ہی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں بڑے محاسب (۳) ہیں۔ ارے ہمارا حساب ہی کیا۔ اگر حق تعالیٰ چاہے قلب کو بدل دے۔ بس سب بھول بھال جاویں۔ تو بس یہ سارے انتظام حق سبحانہ ہی کررہے ہیں۔ اس واسطے وہ وسائط ان کی معرفت میں کیوں حاجب ہوں۔ کچھ بھی نہیں محض ہماری غفلت ہے۔

وسائط ووسائل کا راز

اگر کوئی کہے کہ مجازی بادشاہ کو تو ضرورت ہوتی ہے وسائط (۴) کی۔ حق تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر یہ نہ ہوتے حجاب نہ ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم حکمت کے احاطہ کے مدعی (۵) نہیں لیکن تبرّعًا (۶) اگر اتنا

---

(۱) ان کا حملہ ظاہر تو ہورہا ہے لیکن اس سے ہوا میں کوئی کمی نہیں آرہی (۲) آپ تو ہوا کی مانند ہیں اور ہم غبار کی طرح کہ ہوا تو پوشیدہ ہوتی ہے اور غبار ظاہر (۳) حساب داں (۴) واسطوں کی (۵) ہم نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم ہر چیز کی حکمت جانتے ہیں (۶) بطور احسان۔

بتلادیا جاوے تو مضائقہ بھی نہیں کہ حق تعالیٰ نے جو وسائط تجویز کئے ہیں وہ آپ کی تسلی کے لئے تجویز کئے ہیں۔ چونکہ انہیں بندوں سے کمالِ محبت ہے اس لئے ان کی راحت کے لئے وسائط کا انتظام کردیا کہ آگ تم جلادو کھانا ہماری قدرت سے پک جاوے گا۔ باقی طبخِ طعام(۳) میں حقیقۃً آگ کا کچھ دخل نہیں۔ حضرات صوفیاءِ کرام نے اسے خوب سمجھا ہے آپ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

مثلاً سُرخ جھنڈی ریل کے روکنے کے واسطے کی جاتی ہے اور سبز جھنڈی تیز کرنے کے واسطے جو اس کی حقیقت جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اصل میں ڈرائیور چلاتا ہے اور وہی روکتا ہے اور جھنڈی محض ایک اصطلاحی علامت ہے اُس کے چلانے یا روکنے کے لئے۔ اب دیکھنے والوں میں ایک تو انجینئر ہے جو انجن کے کل پرزوں کا ماہر ہے اور ایک دیہاتی گنوار ہے۔ دیہاتی تو یہ سمجھے گا کہ جھنڈی سے ریل رُکتی ہے اور جھنڈی سے ہی چلتی ہے۔ یہ گنوار اس کافر سائنس دان کے مشابہ ہے کہ جس نے خدا کو ایک پنشنر سے بھی کم کردیا ہے کہ وہ وسائط کو مؤثر حقیقی سمجھتا ہے اور خدا کو اگر مانتا بھی ہے تو بالکل بیکار سمجھتا ہے۔ (نعوذ باللّٰہ) اور جو سائنس دان ذرا مسلمان ہے وہ خدا کو بیکار تو نہیں سمجھتا، مگر وہ بھی اتنا ہی سمجھتا ہے کہ جیسے کوئی گھڑی میں کوک(۴) دے کے الگ ہوگیا۔ اب جس طرح کوک دینے والے کی مدد گھڑی کے افعال بغیر کوک دینے والے کی مدد کے جاری رہتے ہیں۔ اُسی طرح اُن کے زعم میں عالم کی بھی حالت ہے کہ ایک بار اشیاء کو پھیلا کر کے اور اُن میں خواص و دیعت کر کے پھر اُن کا کچھ دخل نہیں رہا۔ باقی جو محققین ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر آن اور ہر شان میں خدا کے تصرف کی ضرورت ہے۔ جس طرح سرخ

---

(۱) کھانے کے پکنے میں (۲) گھڑی میں چابی دیکر الگ ہوگیا (۳) جو حقیقت شناس محققین ہیں۔

جھنڈی کہ محض علامت واصطلاح ہے اسی طرح آگ بھی محض ایک علامت ہے۔ باقی اثر اس کا خاص تصرفِ حق سے ہوتا ہے اور اگر آگ مؤثر بالذات ہوتی، تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی تاثیر اس وقت کہاں گئی تھی جب ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تھا۔ باقی قصہ میں کسی کو شبہ ہو تو یہ خبر صادق سے ثابت ہے جس کا صدق قطعی (۱) ہے جس میں مجالِ انکار نہیں۔

جمادات کا شعور

اسی واقعہ کے مشابہ مولانا نے ایک حکایت تحریر فرمائی ہے کہ ایک بادشاہ لوگوں سے بُت پرستی کراتا تھا۔ چنانچہ ایک عورت سے کہا گیا۔ اُس نے انکار کیا۔ اُس کے پاس ایک بچہ تھا، اُس بچے کو چھین کر آگ میں ڈال دیا۔ قریب تھا کہ وہ عورت مبتلائے فتنہ ہو جاوے۔ قدرتِ خدا سے وہ بچہ آگ میں صحیح سالم اپنی ماں سے کہنے لگا ؎

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت　　بانگ برزد طفل کأنی لَمْ اَمُتْ
اندر آ اسرارِ ابراہیمؑ بیں!　　کور آتش یافت ورود یاسمیں (۲)

پھر تو ماں بھی کود پڑی اور جو بچہ کہتا تھا سب کو مخاطب کر کے وہ بھی کہنے لگی، اب تو لوگ بھی لگے گرنے اور کوئی بھی نہ جلتا تھا۔ جب یہ رنگ دیکھا، تو بادشاہ بہت جھنجلایا اور آگ سے کہنے لگا کہاں گئی تیری وہ تیزی اور حرارت۔ تو جلاتی کیوں نہیں؟ آگ جواب دیتی ہے ؎

گفت آتش من ہما نم آتشم　　اندر آتا تو بہ بینی تابشم (۳)

(۱) جس کا سچا ہونا یقینی ہے (۲) بچے کی ماں بت کو سجدہ کرنے ہی والی تھی کہ بچے کی آواز آئی کہ میں تو گویا مرا ہی نہیں اے ماں تو بھی اندر آجا اور آگ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسرار کو دیکھ یہ آگ تو میرے لئے گل وگلزار ہے (۳) آگ بولی میں تو وہی آگ ہوں جس کا کام جلانا ہے تو اندر آ تو دیکھ میں تجھ کو کیسا جلاتی ہوں۔

یعنی میں آگ ہی ہوں تو آ کے دیکھ لے کہ میں کیا ہوں مگر ؎

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم تیغ حقم ہم بدستوری برم (۱)

یعنی خدا کی تلوار ہوں بغیر حکم کے نہیں کاٹ سکتی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ ان بامن تو مردہ باحق زندہ اند (۲)

اور واقعی اگر زندہ نہ ہوتے تو ان میں ادراک کیسے ہوتا' اور ادراک نہ ہوتا تو۔۔

﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ﴾

''یعنی ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیمؑ پر سرد اور سلامتی ہو جا''

اس کے کیا معنی ہوتے؟ چنانچہ فرشتوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ آگ کو سرد کر دیں یا ابراہیم علیہ السلام کو بچا لیں۔ بلکہ خود آگ کو خطاب کیا گیا۔ اور خطاب میں مجاز خلاف اصل ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ مفسرین نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اگر ''برداً'' کے بعد'' سلاماً'' کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف بن جاتی اور اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برودت (۳) کی اذیت ہوتی۔ ''سلامًا'' فرمانے سے وہ بردوسلام ہوگئی۔ تو یہ صاف دلیل ہے' ان جمادات کے ذی شعور ہونے کی۔

وسائل کو اختیار کرنا عملی دعاء ہے

خیر یہ مسئلہ تو استطراداً (۴) آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ کوئی چیز بالذات مؤثر نہیں' محتاج ہیں تصرّف حق کے۔ پس کھانے کے نیچے آگ جلانے سے کھانا نہیں پکتا بلکہ پکانے والے حقیقت میں وہی ہیں۔ لیکن اگر آگ جلانے کی اصطلاح نہ ہوتی تو یہ پتہ نہ لگتا کہ اس وقت کس واسطے سے مقصود حاصل ہوگا اور یہ ایک بڑی

(۱) نہ تو میری طبیعت بدلی نہ میرے عناصر بدلے البتہ میں تو حق کی تلوار ہوں اسی کے حکم سے کاٹتی ہوں (۲) مٹی' ہوا' پانی اور آگ سب اس کے بندے ہیں میرے اور تیرے نزدیک بے جان اور عنداللہ جاندار اور اس کے حکم کے تابع ہیں (۳) ٹھنڈک سے تکلیف ہوتی (۴) ضمناً آ گیا۔

مصیبت ہوتی۔ پس یہ آگ جلانا ایک دُعا ہے کھانا پکانے کی۔ گو قولی دُعا نہیں مگر حالی و عملی دُعا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے بادشاہ کو سلام کیا اور اُس نے اُسے دس روپے دے دیئے کہ ع

سلامِ روستائی بے غرض نیست (۱)

اسی طرح اگرچہ آگ جلانے والا حق تعالیٰ کا منکر ہی ہو مگر وہ جب حالاً درخواست کرتا ہے کھانا پکادیتے ہیں۔ اگر آگ نہ ہوتی تو ضرورت کے وقت قولاً(۲) دعاء کرنا پڑتی کہ اے اللہ کھانا پکادیجئے مگر اس سے تسلی نہ ہوتی کہ خدا جانے اس سے پکے گا بھی یا نہیں نیز درخواستوں میں تعارض ہوتا کہ ایک تو یہ درخواست کرتا کہ پکادیجئے اور اس کا پڑوسی یہ کہتا کہ کچا رہنے دیجئے۔ اس لئے ایک ایسا قاعدہ مقرر کردیا جس نے تشویش (۳) سے بچادیا۔

اختیارِ اسباب کا درجہ

اس رعایت وشفقت کی قدر کی ہے صوفیہ کرام نے' کہ ترکِ اسباب کی اجازت نہیں دیتے۔ جیسے غلاۃ فی الزہد(۴) کرتے ہیں۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ ایسا زاہد بے ادب ہے۔ کمال اُن ہی حضرات کا ہے کہ اُنہوں نے زہد کو جمع کیا ہے اسباب کے ساتھ چنانچہ وہ کہتے ہیں سنسان جنگل میں بیٹھنا توکّل میں جائز نہیں۔ گھر ہی بیٹھو اور دروازہ کھول کے بیٹھو' مگر دروازے کو دیکھو مت۔ اسی کی نسبت غیر عارفین نے تنگ ہوکر کہہ دیا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش (۵)

(۱) منہ دیکھے کا سلام بے مقصد نہیں ہوتا (۲) زبان سے کہنا پڑتا (۳) پریشانی سے بچادیا (۴) جیسے وہ لوگ کرتے ہیں جو زہد اور تقویٰ میں مبالغہ کرتے ہوں (۵) تختہ پر ہاتھ پیر باندھ کر دریا کے درمیان چھوڑ دیا گیا اس کے بعد مجھ سے کہا جاتا ہے کہ خیال کرنا کپڑے نہ بھیگ جائیں۔

مگر یہ دشواری اُس کو ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور جو تیرنا جانتے ہیں اور ان کے دامن بھی اونچے ہیں وہ کھڑے ہوکر تیرتے ہیں اور دامن کو صاف بچالیتے ہیں۔ کیونکہ محققین ہمیشہ جامع بین الاضداد(۱) ہوتے ہیں۔ اسی واسطے اسباب سے استعمال کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور توجہ کا تعلق نہیں بھی رکھتے۔ بہرحال یہ تو معلوم ہوگیا کہ وسائط برائے نام اسباب ہیں اور درحقیقت کرتے سب کچھ وہی ہیں ؎

کارِزلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چیں بستہ اند (۲)

اس واسطے فرمایا:

﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَابَیْنَھُمَا﴾

''کہ سب کا مربی حق تعالیٰ ہے' خواہ وہ آسمان ہوخواہ زمین خواہ اُن کے درمیان کی چیزیں ہوں''

اس میں تمام اعیان واغراض واسباب آگئے' تو تمام وسائط بھی انہیں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ تو اُن کا کتنا بڑا احسان ہوا' تو یہ بات'' رَبِّ السَّمٰوات '' فرمانے سے حاصل ہوئی ''رَبُّکُمْ'' میں یہ حاصل نہ ہوتا۔ کیونکہ اس وسائط کا تخلل احسان تام پر نظر نہ جانے دیتا۔ (۳) اب اس تخلل کا بھی جواب ہوگیا کہ گو یہ وسائط ہیں مگر یہ سب بھی بے اثر اور مربوب محض (۴)۔ تو ان کے اسباب مسببات میں بھی وہی مربّی ہیں۔

(۱) محققین ہمیشہ متضاد باتوں کو جمع کردیا کرتے ہیں (۲) تیری زلف کی کارستانی ہے کہ ہر طرف مشک کی خوشبو پھیلی ہے عاشقوں نے کسی مصلحت کے سبب یہ کہا کہ ہرن کے نافہ سے مشک کی خوشبو نکلتی ہے (۳) واسطوں کا درمیان میں ہونا ان کے کمال احسان پر نظر نہ پڑنے دیتا (۴) اس بات کا جواب بھی ہوگیا کہ واسطے ہیں ضرور مگر ان میں بھی اثر اللہ کے پیدا کرنے سے ہی ہوتا ہے خود نہیں۔

مناظرہ کا ادب

آگے تفریع فرماتے ہیں۔ ''فاعبدہ'' یعنی اس احسان کا مقتضا یہ ہے کہ ان کے آگے غایتِ تذلیل اختیار کرو اور یہاں پر'' سَمٰوَاتِ'' کو جمع لانے اور ''ارض'' کو مفرد لانے میں ایک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں پر مناظرین کو ادب سکھایا گیا ہے کہ گو واقع میں'' سَمٰوَاتِ'' کی طرح ''ارض'' بھی متعدد (۱) ہیں مگر چونکہ وہ اس جگہ مقصود بالبحث نہیں اور اُن کے تعدد میں فلاسفہ کا اختلاف (۲) ہے۔ اس لئے ہم نے اُس کے تعدد کی تصریح نہیں کی کہیں ایسا نہ ہو کہ منکرین جو مقصود بالخطاب ہیں اسی بحث میں اُلجھنے لگیں اور مقصود رہ جائے۔ اس لئے ہم مقدمات مقصود کے ایسے لاتے ہیں جس میں جھگڑا ہی نہ ہو سکے کیونکہ ''ارض'' کے وجود کا تو انکار کر ہی نہیں سکتے۔ (۳)

پس اس میں مناظرین کو تعلیم ہے کہ مخالف سے کلام کرتے وقت ان امور کا لحاظ رکھا کرو۔ مگر ہم لوگوں نے ان آداب کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب تو بحث میں زوائد ایسے لاتے ہیں کہ ان میں اتنا جھگڑا بڑھ جاتا ہے کہ مقصود کا وقت ہی نہیں آنے پاتا۔

ہمیشہ کی غلامی

بہرحال ''فاعبدہ'' میں حکم ہے کہ غلام بن جاؤ' پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ہم لوگوں میں ایسے حیلہ جُو اور بہانہ باز (۴) بھی ہیں کہ صرف ''فاعبدہ''

(۱) جیسے آسمان کئی ہیں یعنی سات اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں (۲) فلسفیوں کا اس میں اختلاف ہے کہ زمینیں کئی ہیں کہ نہیں (۳) یعنی متعدد زمینیں ہونے میں تو انکار ہو سکتا ہے لیکن ایک زمین کا تو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا کہ مشاہد ہے اس لئے لفظ ''ارض'' مفرد لائے اور ''سموات'' کا لفظ جمع (۴) ہم ایسے بہانے تراشتے ہیں۔

سن کے ایک مرتبہ نماز پڑھ لینے ہی کو یہ سمجھتے کہ بس امتثال امر[1] ہوگیا۔ اس لئے آگے فرماتے ہیں: ﴿واصطبر لعبادته﴾ یعنی اپنی غلامی پر مداومت رکھو۔ پس ایک درجہ غلام بننے کا ہے اور دوسرا درجہ غلامی پر قائم رہنے کا۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ تتمہ ہے ماسبق کا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ فقط غلام ہونا مقصود تھا غلام رہنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ غلام بننے کے بعد پھر اللہ میاں نے آزاد کردیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی آزاد کردیتے تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے کہ ''اعتقہٗ اللّٰہُ مِــنْ رِقّـــہٖ'' یعنی خدا نے غلامی سے آزاد کردیا۔ یا یہ معنی ہوتے کہ یعنی خدا نے عذابِ دوزخ سے آزاد کردیا۔ جیسے آقا اپنے غلام کو بدل کتابت ادا کر کے اُس کو سلاسل واغلال[2] سے آزاد کردے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ معنی تو ہونا محال ہی ہے کہ اُس نے اپنی غلامی سے بھی آزاد کردیا۔ چنانچہ استحالہ اس کا ظاہر ہے مخلوق و مربوب کے لئے مملوک ومحکوم ہونا لازم عقلی[3] ہے۔ جب یہ آزادی محال ہے تو ظاہر ہے کہ غلام رہنا واجب ہے۔ تو اگر ''واصطبر'' بھی نہ ہوتا تب بھی اُس کے معنی کا تحقق واجب تھا۔

آزادی کی حقیقت

یہاں سے حریّت کی بھی تحقیق معلوم ہوسکتی ہے جس کی تمام دنیا میں ہلچل ہے اور اس کو مذہبی وفطرتی حق ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو سمجھ لیجئے! کہ وہ حریّت کون سی آزادی ہے۔ آیا اس حریت کے معنی غیر حق سے آزاد ہونا ہے یا حق سے آزاد ہونا۔

(۱) جو حکم دیا تھا اس پر عمل ہوگیا (۲) مکاتب وہ غلام کہلاتا ہے جس سے آقا نے یہ طے کیا ہو کہ تم اتنے پیسے دے دو تو آزاد۔ اب اس کا آقا خود اس کی طرف سے بدل کتابت ادا کر کے اس کو غلامی کی قید سے آزاد کردے (۳) اس کے محال اور ناممکن ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ جو کسی کی مخلوق اور اس کی تربیت میں ہو وہ لازما اس کی ملک اور اس کے حکم کے ماتحت ہوگا۔

اللہ کی غلامی مطلوب ہے

واقع میں غلامی ہی میں ہمارا فخر ہے نہ کہ آزادی میں۔ چنانچہ جن کو اس غلامی کی حقیقت کا مزہ آ گیا ہے وہ کہتے ہیں ؎

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند (۱)

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک عاشق ہے جس کو معشوق کبھی منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ اُس کو کہیں راستہ میں مل گیا اور اُس نے عاشق کو اس زور سے دبوچا (۲) کہ ایک پہلو کی پسلیاں دوسرے پہلو سے مل گئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ اب دم گھٹ کر نکل جائے گا۔ اس حالت میں محبوب پوچھتا ہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑ دوں اور کسی دوسرے عاشق کو اسی طرح دبالوں۔ تو یہ اُس وقت یہی کہے گا ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۳)

یعنی اس دبوچنے میں تو اگر مر بھی جاؤں تو میری عین سعادت ہے۔ اسی طرح جو محبین خدا کی عبادت میں مقید ہیں اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ اُنہیں اس میں تکلیف بھی ہے۔ اگرچہ اسے تو وہی جانتے ہیں کہ تکلیف ہے یا راحت۔ مگر میں علیٰ سبیلِ التنزُّل کہتا ہوں کہ فرض کرلیا جائے کہ تکلیف ہی ہے تو وہ تکلیف ایسی ہی ہے جیسے مثال مذکور میں۔ اور یہ بات خدا کی محبت میں پیدا ہوتی ہے۔ محبت پیدا کرو اس سے معلوم ہوگا۔

---

(۱) تیرا قیدی جو تیرا عاشق ہے تیری قید سے رہائی نہیں چاہتا تیرا شکار تیرے نشانے سے بچنا نہیں چاہتا
(۲) زور سے دبایا (۳) دشمن کے نصیب میں یہ بات نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو تیری شمشیرزنی کے لئے دوستوں کے سر حاضر ہیں۔

محبتِ الٰہی پیدا کرنے کا طریقہ

اب یہ بات کہ محبت کیسے پیدا کریں؟ سو وہ محبت بھی اس غلامی ہی سے پیدا ہوگی۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ اول اہتمامِ عبادت سے بہ تکلف محبت کی صورت بنایئے۔ پھر انشاء اللہ حقیقی محبت بھی پیدا ہوجائے گی بس یہی طریق ہے جو اپنے کرنے سے ہوگا نہ پیر کی توجہ سے ہوگا نہ فقیر کے تعویذ گنڈوں سے ہوگا' ہاں یہ خدا کی موہبت ہے کہ وہ ہادیٔ برحق تک (۱) پہنچادیں۔ اس میں ہمارا زیادہ دخل نہیں بہرحال ''فاعبدہ'' کے ساتھ'' واصطبر لعبادتہ'' کا بھی ارشاد ہے یعنی اس کی عبادت پر دوام کرو اور ہمیشہ کے لئے پابند بن جاؤ۔

اثباتِ توحید

اب آگے بطور مزید تاکید کے فرماتے ہیں یا یوں کہئے کہ کسی امر کے لئے جس طرح کوئی امر مقتضی (۲) ہوتا ہے اسی طرح کبھی کوئی امر مانع بھی ہوتا ہے تو پہلے ''رب السمٰوات'' میں مقتضی کا ذکر کرچکے۔ اب آگے مانع کو مرتفع فرماتے ہیں کہ

﴿ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ ''تم اس کا کوئی مثل یا ہم نام بھی جانتے ہو؟''

یعنی جب خدا کا مثل یا ہم نام تک تمہارے علم میں نہیں تو اس سے کیوں اعراض کرتے ہو۔ یہ تاکید تو اس طرح ہے کہ جب وہ بے مثل ہے تو غایت اطاعت کا مستحق (۳) بھی وہی ہے اور رفع مانع (۴) اس طرح ہے کہ اس کی عبادت کا مانع یہ ہوسکتا تھا کہ دوسرا کوئی ایسا ہی ہوتا تو پھر یہ سوال ہوسکتا تھا کہ دوسرے کی عبادت کیوں نہ کریں۔ اب یہ مانع بھی متحقق نہیں۔

(۱) یہ خدا کی مہربانی ہے کہ وہ کسی سچے اور برحق شیخ تک پہنچادیں (۲) کسی حکم کی بجا آوری کے لئے کوئی کام اسکا تقاضا کرتا ہے تو اس طرح کوئی اس سے روکتا بھی ہے۔ (۳) حقیقی فرمانبرداری کا وہی مستحق ہے (۴) رکاوٹ اس طرح دور کی۔

اس میں دوسری تفسیر پر ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی ہستی ایسی یکتا ہے کہ مسمّی میں تو کون شریک ہوتا اسم میں بھی اُس کا کوئی شریک نہیں ہوا۔ چنانچہ آج تک دنیا بھر میں اللہ کسی کا نام نہیں ہوا۔ رحمان تو بعض نے اپنا نام رکھ لیا تھا چنانچہ مسیلمہ کو اُس کے معتقد رحمان الیمامہ کہا کرتے تھے مگر اللہ نام کسی نے نہیں رکھا۔ اگر کوئی کہے کہ اچھا ہم اب رکھ دیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت اس ''ھل تعلم'' کا نزول ہوا ہے اس وقت تو نہیں تھا۔ اب رکھنے سے آیت کا معارضہ لازم نہیں آتا۔

یہاں سے اُس شبہ کا بھی جواب ہوگیا کہ قرآن میں ہے:

﴿مَاجَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ﴾ (۱)

''خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے''

اخبار میں چھپا تھا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل تھے۔ جواب کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ماضی کا صیغہ اختیار کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وقتِ تکلم سے زمانہ گزشتہ میں خدا نے ایک سینہ میں دو دل نہیں بنائے اور آئندہ کے متعلق نفی سے سکوت (۲) ہے۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ جب وہ ہستی ایسی یکتا ہے تو پھر اُس کی عبادت کے ترک کی کیا وجہ؟ اس مقصود کے لئے ارشاد فرمایا: ﴿هل تعلم له سميا﴾

شبہ کا جواب

اور اس عنوان میں ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ کوئی خدا کا ہم نام ہو۔ مگر ہمیں اُس کی خبر نہ ہو، تو عدم العلم سے علم العدم (۳) تو لازم نہیں آتا اور مقصود موقوف ہے علم العدم پر۔ تو یہ جملہ مقصود کے لئے کافی نہ ہوا۔

(۱) سورۃ الاحزاب آیت: ۴ (۲) آئندہ کی نفی سے خاموشی اختیار کی ہے (۳) کسی بات کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نام دنیا میں کسی کا ہو ہی نہیں سکتا اور آپ کا مقصود جب حاصل ہوگا کہ یہ نام موجود نہ ہو۔

جواب یہ ہے کہ یہ عنوان قانونی نہیں ہے یہ محض آپ کی شفقت کے واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ بفرضِ محال اگر کوئی ہمنام ہو بھی تو اے مخاطب! جب تجھے اس کی خبر نہیں تو تجھے تو اپنے علم کا پابند ہونا چاہئے۔ تو پھر ''اعراض عن العبادۃ'' چہ معنی؟(۱) اگر یہ عنوان نہ اختیار کرتے تو یہاں بھی ایک مناظرہ کا مسئلہ چھڑ جاتا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ کوئی خدا کا ہم نام نہیں۔ اور اس سے وہی خرابی لازم آتی جو ''ارض'' کے جمع لانے میں مذکور ہوئی۔ کیونکہ یہ مقدمہ مقصود ہے اس کی کاوش سے مقصود کی طرف توجہ نہ رہتی۔ اس لئے صورت مناظرہ کو بچایا ہے اور یہ کمالِ بلاغت ہے کہ مقدمہ مقصود کو خدشہ سے بھی محفوظ رکھ کر مقصود تک پہنچا دیا۔

غلامی کی حقیقت

بہرحال یہ تو نکات ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے غلامی کی تعلیم دی ہے۔ بس ہمیں غلام بننا چاہئے۔ اب آگے غلامی کی تعریفات رہ گئیں کہ غلام کرتا کیا ہے۔ سو وہ تعریفات گو اس مقام پر مذکور نہیں مگر ہر شخص عقل سے معلوم کرسکتا ہے۔ چنانچہ میں ان کو مختصراً بیان کرکے ختم کرتا ہوں۔

غلام یہ کرتا ہے کہ اپنے آقا پر کامل اعتماد رکھتا ہے۔ اُسے اپنا پشت و پناہ سمجھتا ہے۔ آقا اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور آقا پر اُس کے بھروسہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خواہ کیسا ہی قحط ہو اور اس میں اگرچہ آقا بھی فکرمند ہو مگر اُسے یہ سمجھ کر مطلق فکر نہیں ہوتی کہ ہمارا آقا موجود ہے اُسے خود ہمارا خیال ہے۔ اگر آقا صاحبِ قدرت ہوتا ہے تو غلام بھی اس کے بھروسہ دلیر ہوتا ہے۔ کسی مخالف سے ڈرتا نہیں۔ اور اس کے قلب میں آقا کی عظمت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے احکام بغیر ''لِمَ'' اور ''کَیْفَ'' (۲) کے بجالاتا ہے اور اس سے کسی

(۱) پھر عبادت سے روگردانی کا کیا مطلب؟ (۲) اس کے حکم پر فوراً عمل کرتا ہے بغیر اس حکم کی علت و وجہ معلوم کیے

خدمت کا عوض نہیں پوچھتا اور آقا اس میں جو تصرف کرے اُس پر ذرا چون و چرا نہیں کرتا۔ آقا کو کبھی گھر کی صفائی مقصود ہوتی ہے تو غلام کو بھنگی کا لباس پہناتا ہے تو یہ اس میں بھی خوش ہے اور کبھی کہیں اپنی بجائے دعوت میں بھیجتا ہے تو اپنا لباس پہناتا ہے۔ تو یہ اس میں بھی خوش۔ غرض ہر حال میں اُس کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو (۱)

بس حق تعالیٰ کی غلامی میں ہمارا یہ مذہب ہونا چاہئے بس اب آپ اس مختصر کو اپنے تمام احوال میں پھیلا لیجئے اور ہر حال میں یہ دیکھ لیجئے کہ ہم مقتضائے غلامی کے خلاف تو نہیں کر رہے ہیں۔

اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے علم و عمل اور توفیقِ غلامی کی دعا کیجئے آمین یارب العالمین! (۲)

---

(۱) زندہ رکھیں تو آپ کی عطا ہے اگر موت دیں تو میں آپ پر قربان میرا دل تیری محبت میں ڈوبا ہے جو تیرا دل چاہے کر۔ اسی مضمون کو شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ نے اردو میں اس انداز سے ادا کیا ہے:

زندگی دے تو یہ بس تیری عطا ہے یا رب مارنا چاہے تو یہ تیری قضا ہے یا رب
ہم تو بندے ہیں تیرے بس ہے وفا اپنا شعار تو جو چاہے سو کرے تیری رضا ہے یارب

(۲) اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اپنی حقیقی غلامی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خلیل احمد تھانوی
۱۰/محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

العبادة

(حقیقتِ عبادت)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	خطبۂ ماثورہ	۳
۲	تمہید	۳
۳	معنیٔ قال وحال	۴
۴	مقصود بالبیان	۷
۵	پیدائش کی غرض وغایت	۹
۶	کسبِ دنیا اور طلبِ دنیا کا فرق	۱۰
۷	حُبِّ دنیا اور کسبِ دنیا کی پرکھ کا طریقہ	۱۱
۸	عبادت کے معنی وحقیقت	۱۳
۹	تفسیرِ آیت	۱۵
۱۰	شفقتِ ربّانی	۱۶
۱۱	حقیقتِ استخارہ	۱۷
۱۲	حقیقتِ بیعت	۱۸
۱۳	احسانِ ربّانی	۱۹
۱۴	قارون کی سوچ	۲۰
۱۵	انشاءاللہ نہ کہنے پر گرفت	۲۱

۱۶	واسطوں کی اقسام وحقیقت	۲۲
۱۷	مسئلہ جبر وقدر	۲۴
۱۸	وسائط ووسائل کا راز	۲۶
۱۹	جمادات کا شعور	۲۸
۲۰	وسائل کو اختیار کرنا عملی دعاء ہے	۲۹
۲۱	اختیارِ اسباب کا درجہ	۳۰
۲۲	مناظرہ کا ادب	۳۲
۲۳	ہمیشہ کی غلامی	۳۲
۲۴	آزادی کی حقیقت	۳۳
۲۵	اللہ کی غلامی مطلوب ہے	۳۴
۲۶	محبتِ الٰہی پیدا کرنے کا طریقہ	۳۵
۲۷	اثباتِ توحید	۳۵
۲۸	شبہ کا جواب	۳۶
۲۹	غلامی کی حقیقت	۳۷